© rasailojaraid.com

نفاذِ شریعت پر اعتراضات
---- ایک علمی محاکمہ ----

پروفیسر خورشید احمد

(آخری قسط)

اسلام، قائداعظم اور تھیوکریسی

اس سلسلہ کی آخری بات کا تعلق تھیوکریسی سے ہے۔ اصطلاحات کے لیبل لگا کر بحث کرنا استدلال اور موقف کی کمزوری کی علامت ہوتا ہے۔ بلاشبہ قائداعظم نے یہ بات کہی کہ پاکستان تھیوکریسی نہیں ہو گا۔ لیکن یہی بات باقی تمام مسلمان اہلِ علم و فکر بھی کہتے ہیں۔ اور اس سے اسلامی ریاست کی نفی لازم نہیں آتی۔ اس لیے کہ اسلام میں تھیوکریسی کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔ تھیوکریسی نام ہے پاپائیت پر مبنی ریاست کا۔ یہ وہ نظامِ حکومت ہے جس میں حکمرانی کا اختیار مذہبی پروہتوں کو حاصل ہوتا ہے جو خدا کے نمائندے کے طور پر حکمرانی کرتے ہیں۔ روائسٹون پائک "مذہب اور مذہب کی قاموس" میں اس کی یہ تعریف کرتا ہے:

"حکومت کی ایک ایسی قسم جس میں اقتدارِ اعلیٰ کا مرکز خدا یا خداؤں یا کسی اور کتابی قوت کو سمجھا جائے اور حقیقی حکمراں پادری یا مذہبی پروہت ہوں جن کے قوانین کو احکام خداوندی سمجھا جائے۔"

(E. Royston Pike, Encyclopaedia of Religion and Religious, Meridion, Library, 1958. p 347)

تاریخی حیثیت سے اس کی مثالیں یہودیوں، عیسائیوں اور برہمنوں وغیرہ میں ملتی ہیں۔

اسلامی ریاست خدا کی حاکمیتِ اعلیٰ پر مبنی ہے، لیکن یہ تھیوکریسی سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ وجوہِ اختلاف مختصراً یہ ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۱) تھیوکریسی میں حاکمیت کے عملی اختیارات ایک مخصوص مذہبی طبقے کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں جو سیاہ و سفید کا مالک ہوتا ہے، جس کی رائے قانون ہوتی ہے، جس پر کوئی تنقید نہیں کر سکتا، جو خدا کے نام پر سارے اختیارات بلا روک ٹوک استعمال کرتا ہے اور کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتا۔ اسلام میں ایسے کسی مستقل طبقے کا کوئی وجود نہیں۔ بندے اور خدا کے تعلق کو استوار کرنے کے لیے یہاں پروہتوں کے کسی واسطہ اور ذریعہ کی ضرورت نہیں۔ اسلام کی تعلیمات نہ صرف ہر مسلمان کے لیے ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح ہیں بلکہ ان سے واقفیت ہر مسلمان کا فرض بھی ہے۔ سیاست میں بھی نظامِ حکومت چلانے والے خود عوام کے معتمد علیہ ہوتے ہیں اور خدا اور اُمت دونوں کے سامنے جواب دہ ہوتے ہیں، ہر فرد اعلیٰ ترین مقام تک ترقی کرنے کا موقع رکھتا ہے البتہ اسلامی ریاست کے اصحابِ امر کے لیے اگر کوئی شرط ہے تو وہ علم اور تقویٰ کی ہے اور ان کے حصول کے دروازے سب کے لیے کھلے ہیں۔ نیز کوئی بھی تنقید و احتساب سے بالا نہیں، حتیٰ کہ امیرالمومنین بھی قانون اور عدالت کے سامنے اتنا ہی جواب دہ ہے جتنا ایک عام شہری۔

(۲) اسلامی تاریخ میں ہمیں کبھی اس قسم کی پاپائیت نظر نہیں آتی جیسی یورپ یا ہندوستان، جاپان اور تبت میں ملتی ہے۔ ہمارے یہاں علماء ہمیشہ حق کے علمبردار اور آزادی کے محافظ کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ وہ خود ظلم و ستم اور استبداد کا نشانہ بنے ہیں، ان کا ذریعہ نہیں۔ آزادی کی جدوجہد کے سرخیل علماء رہے ہیں اور عالم بننے کا راستہ ہر شخص کے لیے کھلا رکھا ہے۔ نیز عام سیاسی تاریخ میں بھی کوئی مثال نہیں ملتی کہ حکومت یورپ کے "مذہبی دیوانوں" کی طرح عوام کو نشانۂ ستم بناتی ہو۔ اس کا اعتراف خود مغربی مورخین کرتے ہیں کہ مذہبی حکومت کے سلسلے میں یورپ کا تجربہ اور عالمِ اسلامی کا تجربہ ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہے۔ رابرٹ بریفالٹ اپنی شہرہ آفاق کتاب "انسانیت کی تشکیل" میں لکھتا ہے:

> "مشرق (مراد ہے عالم اسلام) میں تھیوکریسی کبھی بھی ذہنی استبداد کا موجب نہیں بنی۔ ہم یہاں ظلمت پسندی، خیالات پر قدغن، اور علم پر پابندی کی کوئی ایسی مثال نہیں پاتے جس کے لیے مغربی دنیا یونان اور روم سمیت مشہور ہے۔"

(Robert Briffault, The Making of Humanity, p - 113.)

(۳) دوسرے مذاہب اور تہذیبوں میں تھیوکریسی میں نام تو خدا کی حاکمیت کا تھا، لیکن چونکہ ان کے پاس زندگی کے ہمہ جہتی مسائل کے لیے کوئی واضح الہامی ہدایت موجود نہ تھی اس لیے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پادریوں اور پروہتوں نے خدا کے حکم کے نام پر اپنی اپنی مرضی مسلط کی اور خدا کے قانون کی بجائے اپنا قانون چلایا۔ یہ قانون ان تمام کمزوریوں اور خامیوں سے آلودہ تھا جن سے انسانی قانون، خصوصیت سے جب وہ ایک طبقے کے مفاد کا محافظ بھی ہو، ہوا کرتا ہے۔ ایسے نظام میں ہمیشہ مذہبی طبقے کو تنقید سے بالاقرار دیا گیا تاکہ اس کی ہر بات بے چون و چرا تسلیم کرلی جائے خواہ وہ کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو۔

اسلام کا سیاسی نظام اس نظام سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں واضح الہامی ہدایت موجود ہے جو اپنی اصل شکل میں محفوظ ہے، اور جس میں ایک شوشے کا تغیر بھی واقع نہیں ہوا ہے اور نہیں کیا جا سکتا۔ اولی الامر سے اختلاف کی پوری پوری گنجائش ہے، بلکہ ان پر تنقید اور محاسبہ فرض کیے گئے ہیں، تاکہ وہ راہِ صواب سے نہ ہٹیں۔ ہر شخص کو اپنی دلیل خدا کے کلام سے لانی ہے جو کسی کا اجارہ نہیں اور جس تک ہر شخص کی رسائی ہے۔ ضرورت صرف علم کی ہے۔ یہ چیز اسلامی نظام کو تھیوکریسی سے بالکل مختلف کردیتی ہے۔

(۴) تھیوکریسی اور اسلام کے مزاج میں ایک اور بھی بڑا لطیف لیکن بے حد اہم فرق پایا جاتا ہے۔ تھیوکریسی کا ایک بنیادی تصور یہ رہا ہے کہ دنیا ایک بری چیز ہے، اس کی زندگی ہمیں گناہ کی پاداش میں اختیار کرنی پڑی ہے، اس کی حیثیت ایک "دارالعذاب" کی سی ہے، اور تمام انسانوں کو اس سزا کو برداشت کرنا چاہیے۔ اس تصور کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست کی اصلاح اور درستگی اور اس کے مظالم کے خلاف آواز بلند کرنا یا جدوجہد کرنا ایک غیر مطلوب شے بن جاتے ہیں اور انسان "تسلیم و رضا" کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ اسلام کا نقطۂ نظر بالکل مختلف ہے۔ انسان خدا کا خلیفہ بنایا گیا ہے۔ زندگی کی نعمتیں اس کے لیے فراہم کی گئی ہیں، اور ریاست کا مقصد زندگی کو نیکیوں اور اچھائیوں سے بھرنا اور برائیوں اور ظلم کے خلاف جہاد کرنا ہے، تاکہ ایک فلاحی معاشرہ قائم ہو سکے۔ اس طرح جو نفسیاتی رویہ اسلامی معاشرہ میں کارفرما ہے اس کی موجودگی میں تھیوکریسی کے پنپنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ تھیوکریسی کی بالکل ضد ہے۔

یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبالؒ سے لے کر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور علامہ محمد اسد (Leopold weis) تک سب یک زبان ہیں کہ اسلامی حکومت اللہ کی حاکمیت اور شریعت کی بالادستی پر مبنی ریاست ہے اور اسے تھیوکریسی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں صاف الفاظ میں فرمایا کہ:

"اسلامی نقطۂ نظر سے ریاست کا مقصد یہ ہے کہ ... قوتوں میں ان مثالی اصولوں کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سمو دینے اور ایک متعین انسانی نظم میں ان کو ڈھال دینے کا (جو توحید کا تقاضا ہیں)۔ صرف اور صرف اس مفہوم میں اسلامی ریاست ایک تھیوکریسی ہے' نہ کہ اس معنی میں کہ اس کی باگیں خدا کے کسی نمائندہ کے ہاتھوں میں ہوں جو منزہ عن الخطاء ہونے کے پردے میں آمریت کا نظام قائم کر سکے۔ اسلام پر تنقید کرنے والوں نے اس بنیادی اور اہم بات کو نظر انداز کر دیا ہے۔"

(Reconstruction of Religious Thought in Islam, P. 154-155)

علامہ محمد اسد کہتے ہیں کہ

"آیا اسلام کا مقصد حکومتِ الٰہیہ (Theocracy) قائم کرنا ہے؟ اگر حکومتِ الٰہیہ سے مراد ایسا عمرانی نظام ہے جس میں تمام قوانین اس سرچشمہ سے نکلیں جسے قوم الٰہی قانون مانتی ہے تو جواب اثبات میں ہوگا' لیکن اگر حکومتِ الٰہیہ کو اس سعی و کوشش کے مترادف بنایا جائے' جو قرونِ وسطیٰ کے یورپ کی تاریخ کے ذریعہ سے روشناسِ عوام ہوئی' یعنی پادریوں کے نظام کو برتر و اعلیٰ سیاسی قوت سونپ دینا' تو جواب قطعی طور پر نفی میں ہوگا۔ وجہ صرف یہ کہ اسلام میں پادریوں جیسا کوئی نظام موجود ہی نہیں اور نہ کوئی ایسا ادارہ ہے جسے مسیحی کلیسا کا مترادف سمجھا جائے۔"

(اسلامی مملکت و حکومت کے بنیادی اصول ۔ صفحہ ۴۲)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے بھی اس مسئلہ پر کئی جگہ بحث کی ہے۔ صرف ایک اقتباس پیشِ خدمت ہے جس سے خود علماء کی پوزیشن سامنے آجاتی ہے۔

"اسلامی ریاست' جس کا قیام اور فروغ ہمارا نصب العین ہے' نہ تو مغربی اصطلاح کے مطابق مذہبی حکومت (Theocracy) ہے اور نہ جمہوری حکومت (Democracy) بلکہ وہ ان دونوں کے درمیان ایک الگ نوعیت کا نظامِ سیاست و تمدن ہے۔ جو ذہنی الجھنیں آج کل مغربی تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہن میں "اسلامی ریاست" کے تصوّر کے متعلق پائی جاتی ہیں وہ دراصل ان مغربی اصطلاحات کے استعمال سے پیدا ہوتی ہیں جو لازماً اپنے ساتھ مغربی تصوّرات' اور اپنے پیچھے مغرب کی تاریخ کا ایک پورا سلسلہ بھی ان کے ذہن کے سامنے لے آتی ہیں۔ مغربی اصطلاح میں مذہبی حکومت (Theocracy) دو بنیادی تصوّرات کا مجموعہ ہے:

(۱) خدا کی بادشاہی قانونی حاکمیت (Legal Sovereignty) کے معنی ہیں اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۲) پادریوں اور مذہبی پیشواؤں کا ایک طبقہ جو خدا کا نمائندہ اور ترجمان بن کر خدا کی بادشاہی کو قانونی اور سیاسی حیثیت سے عملاً نافذ کرے۔

ان دو تصوّرات پر ایک تیسرے امرِ واقعی کا بھی وہاں اضافہ ہوا ہے' اور وہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام انجیل کی اخلاقی تعلیمات کے سوا کوئی قانونی ہدایت نامہ چھوڑ کر نہیں گئے' اور سینٹ پال نے شریعت کو لعنت قرار دے کر عیسائیوں کو احکام توراۃ کی پابندی سے آزاد کردیا۔ اب اپنی عبادت' معاشرت' معاملات اور سیاست وغیرہ کے لیے عیسائیوں کو قوانین و احکام کی جو ضرورت پیش آئی اسے ان کے مذہبی پیشواؤں نے اپنے خود ساختہ احکام سے پورا کیا' اور ان احکام کو خدائی احکام کی حیثیت سے منوایا۔ اسلام میں اس مذہبی حکومت (Theocracy) کا صرف ایک جز آیا ہے' اور وہ ہے خدا کی حاکمیت کا عقیدہ۔ اس کا دوسرا جز اسلام میں قطعاً" نہیں ہے۔ رہا تیسرا جز' تو اس کے بجائے یہاں قرآن اپنے جامع اور وسیع احکام کے ساتھ موجود ہے' اور اس کی تشریح کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی قولی اور عملی ہدایات موجود ہیں جن کی روایات میں سے صحیح کو غلط سے ممیز کرنے کے مستند ذرائع ہمیں حاصل ہیں۔ ان دو ماخذ سے جو کچھ ہمیں ملے صرف وہی من جانب اللہ ہے۔ اس کے سوا کسی فقیہہ' امام' ولی یا عالم کا یہ مرتبہ نہیں ہے کہ اس کے قول و فعل کو حکمِ خداوندی کی حیثیت سے بے چون و چرا مان لیا جائے۔ اس صریح فرق کے ہوتے ہوئے اسلامی ریاست کو مغربی اصطلاح میں مذہبی حکومت (Theocracy) کہنا قطعاً غلط ہے۔

دوسری طرف مغرب میں جس چیز کو جمہوری حکومت (Democracy) کہتے ہیں وہ بھی دو بنیادی تصورات کا مجموعہ ہے:

(۱) عوام کی قانونی اور سیاسی حاکمیت جو عوام کی اکثریت' یا ان منتخب کیے ہوئے نمائندوں کی اکثریت کے ذریعہ سے عملاً ظہور میں آئے' اور

(۲) ریاست کا انتظام کرنے والی حکومت کا عوام کی آزادانہ خواہش سے بننا اور بدل سکنا۔

اسلام اس کے صرف دوسرے جز کو لیتا ہے۔ رہا پہلا جز تو اسے دو حصوں میں تقسیم کرکے قانونی حاکمیت اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص کردیتا ہے جس کے احکام (خواہ وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کتاب اللہ میں ہوں یا سنت رسول اللہؐ میں) ریاست کے لیے ناقابل تغیر و تبدل قانون کی حیثیت رکھتے ہیں' اور سیاسی حاکمیت کو "حاکمیت" کے بجائے "خلافت" (یعنی اللہ' حاکم حقیقی کی نیابت) قرار دے کر ریاست کے عام مسلمان باشندوں کے حوالے کر دیتا ہے۔ یہ خلافت مسلم عوام کی اکثریت یا ان کے معتمد علیہ نمائندوں کی اکثریت کے ذریعہ سے عملاً ظہور میں آئے گی۔ اس بنیادی فرق کو دیکھتے ہوئے اسلامی ریاست کو مغربی اصطلاح کے مطابق جمہوریت (Democracy) کہنا بھی کسی طرح صحیح نہیں ہے۔"

(اسلامی ریاست' صفحہ ۴۷۹' ۴۸۰' ۴۸۱)

یہی وجہ ہے کہ مولانا مودودیؒ نے اسلامی ریاست کے مزاج کو واضح کرنے کے لیے ایک نئی اصطلاح وضع کی "الٰہی جمہوری ریاست" "Theo Democracy" (ملاحظہ ہو' "اسلامی ریاست" ص ۱۳۰)

اس بحث سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ تھیوکریسی کا ہوّا مخالفین کی محض ایک ذہنی اختراع ہے۔ اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں اور علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ سے لے کر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ تک اور تمام ہی مسلمان علماء اور مفکرین نے اسلامی ریاست کو اس سے مختلف اور ممیز نظامِ حکومت قرار دیا ہے۔ شریعت بل کے سلسلہ میں تھیوکریسی کی بحث محض ایک خلط مبحث ہے۔ پھر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ پاکستان ہی نہیں پوری دنیا میں اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد ہو رہی ہے۔ اس عالمی تحریک سے وابستہ علماء اور مفکرین نے تو بڑھ چڑھ کر عوام کے حقوق کی حفاظت کی لڑائی لڑی ہے' جمہوری اداروں کے قیام اور اللہ کے قانون کے سب پر اطلاق کا مطالبہ کیا ہے اور اس جدوجہد میں بیش بہا قربانیاں پیش کی ہیں۔ علماء نے قانون کی تعبیر کا حق بھی صرف اپنے لیے نہیں مانگا۔ ان کا تو موقف ہی یہ ہے کہ ملک کی اعلیٰ عدالتوں کو تعبیرِ دستور و قانون کا اختیار ہونا چاہیے اور عدالتیں ہی یہ طے کریں کہ کونسا قانون شریعت سے مطابقت رکھتا ہے اور کہاں ان کے درمیان تصادم ہے۔ بلاشبہ عدالتوں میں قانون کا علم رکھنے والوں کے ساتھ ساتھ دینی علم رکھنے والے افراد بھی ہونے چاہئیں اور یہ ضرورت ملک کے تعلیمی نظام کی تشکیلِ نو' خود قانون کی تعلیم کی اصلاح اور دینی علم رکھنے والے افراد کو عدالتوں میں مقرر کرنے سے پوری ہو سکتی ہے۔ اس سے زیادہ جمہوری موقف اور کونسا ہو سکتا ہے؟

© rasailojaraid.com
بقیہ بر صفحہ ۴۷